

امریکہ سے تعلقات ... در پیش چیلنج

صدر کلنٹن کا پانچ روزہ دورہ بھارت جس میں جاتے جاتے پاکستان میں پانچ گھنٹے قیام کی زحمت بھی شامل ہے اس خطے کی سیاست میں امریکہ کے مستقبل کے کردار کے خدو خال نمایاں کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دورہ اس علاقے کے باب میں امریکہ کی گزشتہ پچاس برس پر محیط پالیسی میں جوہری تبدیلیوں کا پیامبر ہے امریکی قیادت نے ہر ممکن طریقے سے اپنے عزائم اور نئی ترجیحات کا اظہار کر دیا ہے۔ بھارت سے دوستی اور پاکستان سے کشیدگی کا پیغام بڑا صاف اور معنی خیز ہے پاکستانی قوم اور اس کی قیادت کے لئے کھلا چیلنج ہے ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پوری دیانت، حقیقت پسندی اور ملک و ملت سے وفاداری کے ساتھ امریکہ سے اپنے تعلقات، ماضی، حال اور مستقبل کا جائزہ لیں۔ خوابوں اور خواہشوں کی دنیا سے نکلیں اور نئے حالات اور حقائق کے مطابق اپنے نظریاتی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی مقاصد اور مفادات کے تحفظ اور حصول کے لئے ایک جان دار، واضح اور دیر پا حکمت عملی وضع کریں۔

امریکہ سے تعلقات کا آغاز 1950ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے دورہ امریکہ سے ہوا جو مارچ 2000ء میں صدر کلنٹن کے دورہ بھارت پر ختم ہو گیا امریکہ نے قیام پاکستان کے بعد پہلے چار سال پوری کوشش کی کہ پاکستان، بھارت اور افغانستان یکساں پالیسی اختیار کریں اور پاکستان جنوبی ایشیا کی ایک ریاست کی حیثیت سے آگے بڑھے میں امریکہ کا ساتھ دیں۔ امریکہ کی بے پناہ خواہش اور کوشش تھی کہ اشتراکی دنیا کے گرد جو حصار امریکہ بنانا چاہتا ہے اس میں بھارت اس کا ساتھ دے۔ پاکستان جنوبی ایشیا سے زیادہ اپنے آپ کو وسطی ایشیا اور شرق اوسط کا حصہ سمجھتا تھا اور انہی ممالک کے درمیان اپنے مستقبل کا کردار دیکھ رہا تھا۔ ان حالات میں 1954ء میں پاکستان امریکہ کے دفاعی معاہدوں، سیٹو، سینٹو اور بغداد پیکٹ کارکن اور سرد جنگ میں امریکہ کا سب سے قریبی حلیف بن گیا امریکی جمہوریت کو جنرل ایوب کی فوجی آمریت میں کوئی خرابی نظر نہ آئی اور دونوں خوب شیر و شکر ہوئے۔ جنرل ایوب نے امریکی کانگریس سے خطاب کیا اور ابدی دوستی کے عہد و پیمانہ گئے۔ لیکن 1962ء کی پہلی آزمائش میں امریکہ پھر بھارت کی طرف لوٹ گیا، چین سے نام نہاد مقابلے کے لئے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو کیل کانٹے سے لیس کیا، اعلیٰ ترین جنگی ٹیکنالوجی اور نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے نوازا اور پاکستان کو تقریباً زبردستی کشمیر میں اقدام کرنے سے روک دیا جس سے ایک تاریخی موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر 1965ء میں جب بھارت نے تین سالہ امریکی فوجی اور معاشی امداد سے حاصل ہونے والی قوت کے زعم میں پاکستان پر حملہ کیا تو امریکہ نے اپنے حلیف کا ساتھ دینے کے بجائے دونوں سے برابری کے نام پر پاکستان کی فوجی امداد روک دی حالانکہ بھارت کی فوجی سپلائی کا بڑا انحصار روس پر تھا۔ جبکہ پاکستان کا تقریباً مکمل انحصار امریکی اسلحہ کے نظم پر تھا۔ 1971ء کے نازک لمحہ پر جب بھارت نے دہشت گردی اور مکتی باہنی کی کھلی نائید کی اور پھر نومبر 1971ء میں مشرقی پاکستان پر فوج کشی کی امریکہ نے پاکستان سے اسی طرح بے وفائی کی جس طرح 1965ء میں کی تھی۔ اب جو سرکاری دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان میں امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ کے وہ نوٹ موجود ہیں جو دونوں مواقع پر صدر امریکہ کو لکھے گئے اور دونوں میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ گو پاکستان سے ہماری دوستی اور معاہدات ہیں مگر ہمارے مفادات کا تقاضا ہے کہ ہم بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیں۔

میں اور یہ تینوں مل کر دوسری جنگ عظیم کے بعد کی سیاست امریکہ کی مخالفت کا سب سے نمایاں اظہار ہماری نیوکلیئر پالیسی کے سلسلے میں ہوا جس کے بارے میں امریکی خارجہ سیکرٹری ہنری کسنجر نے ان سارے احسانات کے باوجود جو چین سے روابط کے باب میں پاکستان نے خطرات مول لے کر کئے تھے اور جن کے باعث اسے وفا دار دوست سمجھا جاتا تھا ایک عبرت ناک مثال " بنانے کی دھمکی دی اور کارٹر نے قطع تعلق کر کے معاشی پابندیوں کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تامل سے کام نہ لیا۔ یہ تو افغانستان پر روس کا حملہ اور اشتراکیت کی یورش کے خلاف افغان مجاہدین اور پاکستان کا ڈٹ جانا تھا جس کی وجہ سے امریکہ کو پاکستان کی دوستی کی ضرورت پڑی لیکن جیسے ہی افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے امکانات پیدا ہوئے، افغانستان اور پاکستان دونوں سے آنکھیں پھیر لی گئیں۔

یہ ضرور ہے کہ جزوی طور پر پاکستان کو فوج کی تنظیم نو، عسکری قوت کی تربیت و تزئین اور معاشی میدان میں امریکہ سے اس دور میں کچھ فوائد بھی حاصل ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بہت سے ایسے فوائد ہم حاصل نہ کر سکے جن کا امکان اور موقع تھا مگر قیادت کی نا اہلی، بدعنوانی اور خوشامندانہ ذہنیت کی وجہ سے انہیں حاصل نہ کیا جا سکا لیکن اگر پورے دور کا میزانیہ مکمل معروضی انداز میں تیار کیا جائے تو چند نتائج سامنے آتے ہیں۔

امریکہ نے اس پورے دور میں ہمارے ساتھ ہی نہیں بلکہ دنیا کے جن جن ممالک کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم کیا وہ خالص امریکی مفاد کی بنیاد پر تھا۔ گو اس پورے عرصے میں آزاد دنیا، جمہوری حقوق اور بنیادی آزادیوں کا تذکرہ رہا اور نظریاتی اور اخلاقی اصولوں اور عالمی اقدار کی بات بھی بڑے بلند بانگ انداز میں کی گئی لیکن فی الحقیقت امریکی پالیسی کا ایک ہی مرکزی اصول ہے اور وہ امریکہ کا بحیثیت ایک عالمی قوت مفاد ہے اس کی دوستی نہایت ناقابل اعتماد اور ناقابل بھروسہ ہے اس کے لئے چشم زدن میں آنکھیں پھیر لینا ایک معمول ہے یہ محض ہمارا تجربہ ہی نہیں امریکہ کے اعلیٰ ترین پالیسی سازوں نے پوری میکیاولانہ چابک دستی کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہی ان کی حقیقی پالیسی ہے امریکہ سے پاکستان کے جتنے بھی معاہدے ہوئے ہیں ان میں کبھی بھی امریکہ نے مصیبت کے وقت مدد کی قانونی اور دستوری ذمہ داری قبول نہیں کی۔ کئی امریکی صدور اور خارجہ امور اور دفاع کے سیکرٹریوں نے زبانی مدد کی یقین دہانی کرائی مگر اس کی پابندی ضروری نہیں سمجھی گئی۔ جنرل ایوب نے 12 جولائی 1961ء کو امریکی کانگریس کے مشترکہ اجلاس میں کہا تھا ”وہ لوگ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے صرف پاکستان کے لوگ ہوں گے بشرطیکہ آپ ان کے ساتھ کھڑے ہونے کے لئے تیار ہوں۔“

اس کے جواب میں صدر کنیڈی نے کہا تھا ”پاکستان فوری اور دیر پا ضرورت کے وقت کا دوست ہے امریکی اپنی نجی اور عوامی زندگی میں دوستوں کی دوستی اور اس کی پائیداری کی قدر کرتے ہیں۔“ لیکن 1962ء میں ہی اس کا پول کھل گیا اور پھر امریکی خارجہ سیکرٹری ڈین رسک نے یہ اصول بیان کر کے پاکستان ہی نہیں پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ”وعدے ہمیں کسی خاص اقدام کا پابند نہیں بناتے۔ زیادہ تر معاہدات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جارحیت کی صورت میں ہم مشترکہ خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے دستوری طریق کار کے مطابق اقدام کریں گے ہم دستوری تقاضوں کو کس طرح پورا کریں گے؟ اس کا انحصار صورت حال کے حقائق پر ہو گا۔ بعض صورتیں دوسرے کے مقابلے میں ہمارے کم اقدام کا تقاضا کرتی ہیں۔“

اس کی وضاحت کریں تو محکمہ خارجہ COMMITMENT میں سنٹیئر سیکشن نے وزارت خارجہ کو مجبور کیا کہ وہ 1966 کے ایک سینئر افسر نے اس میکاولین اصول کو بیان کر دیا کہ صدر آج ایک بیان دے سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اگلے دن اس سے دست بردار ہو جائیں امریکہ پر صدر کے بیانات کی وجہ سے کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

پاک امریکی تعلقات کی پچاس سالہ داستان انہی کہ مکرنیوں کی داستان ہے اور اس اصول کا منہ بولنا ثبوت امریکی جمہوریت کے بانی جارج واشنگٹن کا یہ بیان ہے ” ایک چھوٹی اور کمزور ریاست کا، ایک بڑی اور طاقتور ریاست سے تعلق اول الذکر کے لئے آخر الذکر کا لاحقہ ہونا لازمی کر دیتا ہے۔ کسی قوم کا غیر متعلق لوگوں سے ہمدردی کی توقع رکھنا حماقت ہے وہ اس حوالے سے اگر کچھ حاصل کرے تو اسے اپنی آزادی کے ایک حصے سے اس کی قیمت ادا کرنا ہوتی ہے“

چنانچہ امریکہ کی دوستی کا پاکستان کے لئے ایک لازمی نتیجہ سیاسی، معاشی اور خود عسکری میدان میں محتاجی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہم نے عالمی سیاست میں اپنی دوستیوں اور دشمنیوں کو بڑی حد تک امریکہ کے عالمی عزائم اور نظام کے تابع کر لیا اور ایک حقیقی طور پر آزاد اور ملت اسلامیہ کے مفاد کی محافظ خارجہ پالیسی وضع نہ کر سکے۔ معاشی میدان میں ہم بیرونی امداد اور قرضوں کے جال میں پھنتے چلے گئے اور آج عالم یہ ہے کہ قرضوں کی غلامی نے ہماری آزادی کو پابند سلاسل کر دیا ہے۔ فوجی ساز و سامان اور جنگی حالات اور صلاحیتوں کے سلسلے میں بھی ہمارا انحصار امریکہ پر ہو گیا ہے اور چونکہ وہ اپنے وعدوں کا پابند نہیں (حتی کہ ایف 16 جن کی قیمت بھی ہم پیشگی ادا کر چکے ان تک کو نہ ہی ہم حاصل کر سکے اور نہ ہی قیمت واپس لے سکے ہیں) اور جب چاہے اپنے مصالح کے تحت رسد کی راہیں مسدود کر سکتا ہے اس لئے ہماری دفاعی صلاحیت میں مسلسل کمی آرہی ہے۔ یہ دوستی ہمیں ہر میدان میں بحیثیت مجموعی بہت مہنگی پڑی ہے تاہم سارا الزام امریکہ کی مفاد پرستی اور دوغلی پن کو دینا انصاف کے خلاف ہو گا اس نے اپنے قومی مفاد میں جو مناسب سمجھا کیا لیکن اصل ذمہ داری ہماری اپنی قیادتوں کی ہے جن میں فوجی اور سول، مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اس پہلو سے ہمیں صدر کلنٹن کا ایک حد تک ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے بڑی رعونت اور ہتک آمیز انداز میں پاکستانی قوم کی غیرت کو جگایا اور اس کے ضمیر کو جھنجوڑ ڈالا ہے اور ہمیں فیصلہ کن موڑ کی طرف دھکیل دیا ہے۔

جو سوال اس وقت سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ان حالات میں پاکستان کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور وہ کہ وہ کس طرح اس صورت حال کا مقابلہ کرے۔ دکھ افسوس ندامت، غصہ بجا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی حالات کا مداوا نہیں کر سکتی ہمارا رد عمل جذباتی اور وقتی حالات کے دباؤ میں نہیں ہونا چاہئے۔ ایک طبقہ لچک کی باتیں کر رہا ہے اور حقیقت پسندی کے نام پر امریکہ کے نشان زدہ راستے پر کچھ تحفظات اور ظاہری لیبا پوتی کے ساتھ چلنے کا مشورہ دے رہا ہے اس کے لئے حالات کی نا مساعدت، معیشت کی زبوں حالی اور عالمی فضا کی دہائی دے رہا ہے۔ ترکی اور ملائیشیا جیسے دوست ممالک کی سرد مہری سے بھی خوف دلایا جا رہا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی نگاہوں کی بات کی جارہی ہے۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخطوں، جہاد کشمیر میں نرمی، دینی مدارس پر گرفت اور افغانستان سے کشیدگی کے مشورے بھی دینے جارہے ہیں۔ اور امریکہ کی سے خوف اور طمع دونوں کی باتیں CARROT AND STICK ٹریک ٹوڈ پلو میسی کا سپارا لیا جا رہا ہے پالیسی کی جا رہی ہیں۔ یہ آوازیں اور سر گوشیاں ایک محدود طبقے کی طرف سے ہو رہی ہیں جبکہ قوم کی اکثریت دکھ اور صدمے کے ابتدائی احساس کے بعد بالکل ایک نئے اقدام کی متمنی ہے۔ وقت آگیا ہے کہ قوم کسی امریکہ مخالف جذباتیت کا شکار ہونے بغیر پورے عزم اور احترام سے امریکہ کو یہ پیغام دے کہ دوستی اور - تعاون کا راستہ کھلا ہوا ہے لیکن محکومی اور تابعداری کا کوئی - سوال پیدا نہیں ہوتا۔ امریکہ کو حق ہے کہ وہ اپنے مفادات کی خاطر جو روش چاہے اختیار کرے لیکن نسبتاً چھوٹا ملک ہونے کے باوجود پاکستان اور اس کے عوام بھی یہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی آزادی، سلامتی اور قومی مفاد کی روشنی میں اپنا موقف طے کریں۔

اس حکمت علمی کی صحت، صداقت اور افادیت کے بارے میں تو دو رائے ممکن نہیں البتہ اس پر عمل پیرا ہونے کے کچھ تقاضے ہیں جنہیں پورا کئے بغیر یہ موثر نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے دوسروں کی طرف نگاہیں لگانے اور دست سوال دراز کرنے کے بجائے خود اپنے اوپر بھروسہ اپنے اللہ پر بھروسہ اور اپنی قوم پر بھروسہ ضروری ہے اس کے لئے قوم پر اعتماد، اس کو اصل حالات سے آگاہ کر کے جدو جہد پر آمادہ کرنا اور قیادت کی طرف سے وہ مثال پیش کرنا ضروری ہے جس کا نمونہ ہمارے آقا محمد مصطفیٰ میں نے پیش فرمایا کہ آزمائش کی گھڑی میں اگر عام مسلمانوں کے پیٹ پر ایک پتھر ہوتا تو حضور علی کے پیٹ پر دو پتھر ہوتے تھے۔ اندرونی سیکجہتی اور باہمی آویزشوں اور وقتی اور گروہی مصالح سے بالاتر ہو کر پوری قوم کو خود انحصاری کے حصول اور ایسی معاشی اور عسکری قوت کی تشکیل و تعمیر کے لئے سرگرم کرتا ہے جو دشمن پر ہماری ہیبت طاری کر سکے۔ ایٹمی صلاحیت کی حفاظت اور ترقی اس کا ایک پہلو ہے لیکن اسکے ساتھ معاشرتی، ملی یکجہتی، فکری قیادت، تعلیم و تحقیق کے میدان میں اپنا لوہا منوانا بھی ضروری ہے۔ قوم میں حقیقی اسلامی جہاد کی روح اور اجتماعی زندگی میں انصاف اور دولت کی منصفانہ تقسیم اور اس کا موثر ترین ذریعہ ہے۔ آج نفرتوں کی جس آگ میں ہم مجلس رہے ہیں اور غربت اور معاشی فساد کے جس جہنم میں آبادی کا بڑا حصہ مبتلا ہے اس سے نجات ہی ہمیں آزادی اور قومی سلامتی کی حفاظت کے لائق بنا سکتی ہے۔ جمہوری اداروں کا احیاء اور قوم کی معتمد علیہ قیادت کا زمام کار کو سنبھالنا اس عمل کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے ناگزیر ہے۔